وہ بھی شاہ حسین کی مانند ذات جولاہے کی رکھتا تھا...

''فقیر حسین جلاہا..

نہ اس مول نہ لاہا..

نہ گھر باری..ناں اوہ مسافر..

جو آہا سو آہا..!

یا پھر جو بھی عشق آتش میں بھسم ہوتا ہے وہ جولاہا ہو جاتا ہے..

ازل سے جیسے ڈاکیا ایک سے..جس پوسٹ ماسٹر نے اسے روانہ کیا ہے' وہ ایک ہے ایسے ہی برنے کا پیڑ بھی ایک ہے اور اس کی ڈال سے بندھا رسہ بھی وہی ہے البتہ اس کے ساتھ جھولنے والے بدل جاتے ہیں..

کیفیت وہی رہتی ہے لیکن جھولنے کے انداز بدل جاتے ہیں..

کبھی نامہ بر اور قاصد کا انتظار ہوا کرتا تھا' اس کے آنے سے پیشتر ہی یہ جان لیا جاتا تھا کہ وہ کیا لکھیں گے جواب میں اور ایک اور خط لکھ لیا جاتا تھا..سیاں جی کے نام چٹھی لکھی جاتی تھی اور اکثر لکھوائی جاتی تھی..

زمانے بدل گئے تھے!

قاصد..نامہ بر اور چٹھیاں متروک ہو گئی تھیں..جیسے زمانوں کے بدلنے سے خدا متروک ہو جاتے ہیں' ایسے وہ دور بھی ماضی کی گپھا میں گم ہوا اور ان کی جگہ براہ راست صوت و آواز وصیلۂ وصل و جدائی ٹھہرے...کمپیوٹر پر ای میل اور وائس چیٹ سے رابطے ہونے لگے..ٹیلی فون نامہ بر ہو گیا..

زمانے بہت بدل گئے..وقت بہت گزر گئے..پوشاکیں..رہائش گاہیں اور مذہب اور کے اور ہو گئے لیکن حافظ برخوردار کے عشق کا ہاتھی نہ بدلا وہ اب بھی اسی طور روندتا تھا..پوش کریندا پوش...

عشق اور جنسی عمل ایک ہوتے ہیں..

جیسے جنس کا حرکتی عمل آدم سے لے کر لمحۂ موجود تک..زمانے اور وقت سے ماورا ایک ہی انداز میں...ایک اُکتا دینے والی یکسانیت کے ساتھ اسی ایک انداز میں چلا آتا ہے' اسی طور عشق بھی ہمیشہ سے وہی آگ ہے جو جلائے نہیں جلتی اور بجھائے تو بالکل نہیں بجھتی..نہیں بنتی!

عشق اور جنس پر.. بلیک ہول اور روشنی کی تکونوں کا.. روشنی کی رفتار سے بھی تیز زمانوں کے گزرنے کا کچھ.. ذرّہ بھر اثر نہیں ہوتا.. یہ دونوں بہت ڈھیٹ ہیں اور اس کا جذبہ.. عشق کا.. اور اس کا تحرک.. جنس کا ہمیشہ ایک سا رہتا ہے..

ٹیلی فون قاصد ہے.. نامہ بر ہے.. لیکن یہ اپنی مرضی کا نامہ بر ہے.. جی چاہے تو نامہ لے آئے نہ جی چاہے تو گنگ پڑا رہے..

ایک ایسا دربان بن چکا ہے یہ ٹیلی فون کہ جس کے اذن سے ہی محبوب تک رسائی ممکن ہوتی ہے.. بے شک مدتیں بیت جائیں اس کی گھنٹی بجتی ہے تو دل رُکتا ہے کہ شاید وہ ہو.. یہاں تک کہ ایک شاپنگ پلازہ.. کسی دوست کے گھر میں.. کسی پوسٹ آفس میں کھڑے اندر کہیں کسی کی میز پر فون کی گھنٹی بجتی ہے تو بھی اس کی آواز سن کر ایک لمحہ اسی آس کا اترتا ہے کہ شاید اس کا ہو.. اور اگلے ہی لمحے حماقت کا احساس ہوتا ہے اور پھر بھی مایوسی ہوتی ہے کہ یہ اس کا فون نہیں ہے..

وہ بھی ایک مدت سے منتظر تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجے اور دوسری جانب وہ ہو.. اور ایسا ہو نہیں رہا تھا.. وہ جو روندا جا چکا تھا.. اس کا حال اس انتظار میں سودائیوں ایسا ہو رہا تھا.. وہ اس بدصورت سیاہ رنگ کے بدہیئت آلے کو.. دن رات فراموش کر کے.. بھوک پیاس سے ماورا تکتا رہتا تھا اور اس کی منت کرتا تھا' اپنی آنکھوں سے.. اور کبھی دھمکیاں دیتا تھا کہ اے بے ہنگم شکل کے آلے تیرے اندر جو گھنٹی ہے وہ اس کے پوروں تلے دبتے نمبروں کے زور سے کیوں نہیں بجتی.. تیرے بخیے جئیں اس کی آواز سنا دے.. تو اگر ایسا کر دے تو میں تجھے دیسی گھی سے نچڑتی شکر بھری چُوری کھلاؤں.. تیرے پاؤں میں چاندی کی جھانجھریں باندھوں کہ تو وہ کاگا ہے جو پیا کا سندیسہ لا سکتا ہے.. اس پیا کا جس نے اپنے آخری خط میں مردہ شاعرہ کا شعر لکھ کر اسے بے عزت کر دیا تھا..

تو اس مدت میں کوئی ایک رات ہے..

شاید وہی رات ہے سردیوں کی جب اُدھر برنے سے وہ جولاہا جھول رہا ہے اور ادھر ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے اور دوسری جانب وہ ہے ''ہیلو..'' اور یہیں سے برنے کے پیڑ سے الٹا جھولتا حال کھیلتا جولاہا ٹیلی فون کے چونگے کو کان سے لگاتا ہے تو اس ایک ''ہیلو'' کو سنتا ہے جس کے لیے وہ صدیوں سے منتظر تھا..

باجھ سجن مینوں ہور نہ سُجھدا

تن تندور' آہیں دے لعنو سیج چڑھی مینڈھا تن من بُجھدا
تن دیاں تن جانے' من دیاں من جانے' محرم سو جو دل دیاں بُجھدا

تو وہ جسے اس کے سوا اور کچھ سجھائی نہ دیتا تھا.. جس کا تن تندور تھا.. جس میں آہوں کے الاؤ اب بھی بھڑکتے تھے وہ چونگے کو کان کے ساتھ اتنی شدت سے دبائے کہ وہ دکھنے کو آتے تھے اس وہم سے کہ کہیں اس کی آواز کوئی راہ پا کر فرار نہ ہو جائے۔ اپنی نشست سے اٹھتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس ''ہیلو'' کے بعد جو کچھ کہا جانے کو ہے وہ کیسے وصول کرے اور جب اس کی سمجھ بوجھ جواب دے جاتی ہے تو وہ چونگے کو کان کے ساتھ بھینچے اٹھتا ہے اور ننگے فرش پر لیٹ جاتا ہے اور تڑپتا ہے.. نڈھال ہوتا مسرت سے اور اپنی خوش بختی پر یقین نہ کرتا ہوا.. اب بھی شک کرتا ہوا کہ یہ وہی ہے.. کوئی دھوکا فریب تو نہیں.. وہ بے قابو کیفیت میں لیکن یہ احتیاط کرتا کہ چونگا کان سے بال برابر بھی الگ نہ ہو.. وہ یوں تڑپتا ہے جیسے حال پڑ گیا ہو اور وہ اس سے باتیں کرتا چلا جاتا ہے.. وہ اپنی کہے جاتی اور وہ اپنی.. نہ دونوں میں سے کوئی ایک سانس لیتا ہے اور نہ دوسرے کی سنتا ہے اور پھر بھی سب کچھ سجھائی دے رہا ہے..

وہ اس سے باتیں کرتا جاتا ہے.. ننگے فرش پر لوٹتا ہے.. بے سُدھ جولاہا..

اور وہ جانے کہاں ہے.. شاید کسی فائیو سٹار ہوٹل کی آسودگی میں.. کسی پبلک کال آفس میں یا کسی ایسے گھر کے صحن میں جس کی دیواروں کے ساتھ جو بیل چمٹی ہوئی تھی.. ایک فائر کی دہشت میں جو اکھڑ گئی تھی اور اب سوکھ چکی ہے' اس کی قربت میں وہ بیٹھی ہے اور اب اطمینان سے.. مایوسی از حد جو اطمینان تخلیق کرتی ہے اس میں.. وہ باتیں کرتی ہے اور خوب آگاہ ہے کہ دوسری جانب جو شخص ہے وہ اس کی آواز سن کر کیسے نڈھال ہو رہا ہے.. اگر آگاہ نہ ہوتی تو کبھی اپنی ملوک پوروں سے اس کا نمبر نہ دباتی..

اس کی باچھیں اس کے قابو میں نہ تھیں.. اتنا نڈھال اتنا خوش اور اس کا بدن ایک مدت کے تناؤ میں جکڑے رہنے کے بعد آزاد ہو گیا تھا اور وہ ننگے فرش پر بخوشی اپنی مرضی سے لوٹتا اس سے باتیں کرتا جاتا تھا..

کیا یہ ممکن ہے کہ جولاہا وہی ہو؟
گڑھے میں پاؤں لٹکائے کھیس بنتا..
برنے سے جھولتا..

اور کان سے فون کا چونگا چپکائے ننگے فرش پر لوٹتا..

عشق کا ممکنات سے کوئی واسطہ نہیں..

ہم جو ایک ہی زمان و مکاں کے عادی ہیں اور اس کے باسی ہیں ان کے دھیان محدود ہیں اور وہ ہر شے کو ممکن یا ناممکن کے سوا اور کچھ اس دھیان میں شامل کرنے سے قاصر ہیں..

یہ دھیان گیان.. سمجھ بوجھ اور فہم و فراست عشق کے زمان و مکاں کی تفسیر نہیں کر سکتے کہ وہ اس مقام پر آ کر اپاہج ہو جاتے ہیں..

اسی لیے وہ ممکن اور ناممکن کے الجھاؤ میں الجھے یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ ایک جولاہا بیک وقت.. ایک ہی معینہ لمحے میں کھیس بھی بُن سکتا ہے.. برنے کے رسّے کے ساتھ بندھا جھول سکتا ہے اور ننگے فرش پر لوٹتا اس سجن کی آواز بھی سن سکتا ہے جس کے سوا اسے اور کوئی نہیں سوجھتا۔

کیا یہ تم ہو..

ہاں...

کیا یہ تم ہو..

ہاں..

اور اسے یقین نہیں آ رہا اور وہ ''کیا یہ تم ہو؟'' کی گردان کرتا.. پکارتا.. سسکتا.. کبھی چیختا اور کبھی سرگوشیاں کرتا کہ کیا یہ تم ہو.. ننگے فرش پر لوٹتا چلا جاتا ہے..

ہاں.. یہ میں ہوں!

ہاں.. یہ میں ہوں!

اور فون کے چونگے میں سے برآمد ہوتی جو اس کی آواز ''ہاں.. یہ میں ہوں.. ہاں یہ میں ہوں'' آتی تھی تو ایک مخصوص ردھم میں آتی تھی.. کھڈی کی کھٹ کھٹ ردھم میں اور.. ورق کوبوں کی سونے چاندی کے ورق ایک چوبی ہتھوڑے سے کوٹے جانے والی ردھم.. ردّی کاغذ میں سونے چاندی کے نامعلوم ذرے رکھ کر انہیں تب تک دھم دھم کوٹے جانے کی ردھم کہ جس کے نتیجے میں وہ ورقوں میں بدل جاتے تھے..

ان تینوں کی لے سانجھی تھی..

ورق کوبوں کی اس دھم دھم کی نغمگی کے تسلسل نے عطار کو کپڑے پھاڑ کر جنگل کی راہ دکھائی تھی..

کھڈی کی اس کھٹ کھٹ پر شاہ حسین نثار ہوا اور ہمیشہ ورق کوبوں کے محلے میں سے گزر کر ہر شام دریائے راوی کے کنارے پہنچتا تھا..اپنے مادھولال کے ساتھ!

ہاں...جیسے عشق اور جنسی عمل کبھی نہیں بدلتے..ایسے ہی ایک جولاہا بھی کبھی نہیں بدلتا..

برنے کے پیڑ سے جھولتا' اندھیری کوٹھڑی میں کھیس بُنتا یا ننگے فرش پر کانوں سے چونگا لگائے تڑپتا بے حال ہوتا..ایک ہی جولاہا ہوتا ہے..

لیکن ایک ایسا فون آیا ہی نہیں تھا جس کے دوسری جانب وہ ہوتی جس کے صحن کی دیوار سے چمٹی بیل ادھڑ کر نیچے آ گری تھی..وہ ہمیشہ کے لیے گم ہو چکی تھی اور باقی صرف نامردی' بزدلی اور ایک شعر رہ گیا تھا..یہ جولاہے کا گمان تھا کہ ایک ایسا فون کبھی نہ کبھی آئے گا..پر وہ نہ آیا..

اور یہ خط اسی کے نام کا ہو سکتا ہے..اس کی جانب سے جو گم ہو چکی تھی..

اس کے..جس نے یہ خط بھیجا تھا..جس کسی نے بھی بھیجا تھا' اس کے بس میں یہ بھی تھا کہ اس جولاہے کی ناک جب برنے کی بلند ترین شاخ کو چھوئے تو یہ خط وہاں پیش کر دیا جائے..

جب اندھیاری کوٹھڑی میں وہ الجھاؤ والے دھاگوں سے کھیس کی بُنت کرتا تھا تب..یا ننگے فرش پر لوٹتے ہوئے..اگرچہ یہ ایک گمان تھا..

یہ تینوں پتے تو عیاں تھے..خط ان پر جانا چاہیے تھا..

لیکن نہیں گیا..

ایک ایسے پتے پر گیا جو پتہ ہی نہ تھا..

وادیٔ شگر سے آگے..پرشور نالے کے پار تو کوئی پتہ نہیں..

کہتے ہیں کہ فرشتۂ اجل تمہیں وہیں لے جاتا ہے جہاں اس نے طے کر رکھا ہوتا ہے کہ بس یہیں میں نے اس کی جان قبض کرنی ہے..

تو یہ بھی طے ہو چکا تھا کہ اس جولاہے کو جو خط پہنچانا ہے وہ..وادیٔ شگر سے آگے پرشور نالے کے پار ہی پہنچانا ہے..

تو یہی پتہ ہے!

اسی کا ہو سکتا ہے جو گم ہو چکی تھی...

جولاہا اپنی اندھیاری کوٹھڑی میں گڑھے میں ٹانگیں لٹکائے سر جھکائے الجھے ہوئے دھاگوں سے ایک ایسا کھیس بُنتا جا رہا ہے جس کے ڈیزائن میں کوئی ربط نہیں...ایک پھول ابھرتا ہے تو کھٹ سے اس کی جگہ ایک خلاء آ جاتا ہے اور پھر کوئی سیاہ حاشیہ جنم لینے لگتا ہے جو غمِ حسین کے دھاگوں سے وجود میں آنے لگتا ہے..کبھی کوئی بیل دو چار پتے زرد رنگ کے ظاہر کرتی ہے تو اگلی کھٹ سے وہ سرخ ہو جاتے ہیں..

کھیس کی سطح بھی ہموار نہیں کہیں کہیں سُوت کی گانٹھیں ابھری ہوئی ہیں..

جولاہا سر جھکائے بُنتا جا رہا ہے..

ایک اور کھٹ ہوتی ہے اور کھڈی اٹک جاتی ہے..ایک دھاگہ کھیس کا حصہ بننے سے انکاری ہو جاتا ہے کہ اس میں ایک بڑی پکی پیڈی گانٹھ ہے....

جولاہا زور لگاتا ہے کہ الجھا ہوا یہ دھاگا کھیس میں بُنا جائے..اور وہ نہیں بُنا جاتا۔

یہ گانٹھ ایک نادیدہ غیر قدرتی اور نہ سمجھ میں آنے والا عشق ہے جس کی بنیاد صرف خطوط تھے...

ان دونوں نے کبھی بھی..ایک دوسرے کو دیکھا تک نہ تھا..

یہ خط ایک نتالیہ کی جانب سے ایک اَن دیکھے رُودین کو لکھے گئے تھے..

کیوں نہ اس گانٹھ کو کھولنے کی سعی کی جائے..

برنے کے پیڑ کی شاخ سے بندھے رسّے کے ساتھ تو الٹا لٹکا جولاہا بھی جب ایک حیوانی زور لگاتا' اس ڈال سے بھی اوپر نکل جاتا ہے جس کے گرد وہ رسہ جکڑا ہوا ہے تو جن شاخوں کو اس کی ناک چھوتی ہے اس کے ہر پتے پر نتالیہ اور رُودین کی مہریں ثبت ہیں..اور وہ وہیں معلق

رہتا ہے جھولتا ہوا نیچے نہیں آتا اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہ پتے خزاں رسیدہ ہو کر جھڑتے ہیں اور جب گرتے ہیں تو فل سکیپ لکیر دار کھردرے کاغذ پر لکھے ہوئے سینکڑوں خطوط کی صورت گرتے ہیں..

کیوں نہ جولاہے کو اس معلق حالت سے نجات دلا دی جائے..تا کہ وہ پھر سے حال مست جھولنے لگے..

اور اس گانٹھ کو کھولنے کی کوشش کی جائے جس میں نتالیہ اور رُودین بندھے ہوئے ہیں..ایک نادیدہ، غیر قدرتی اور نہ سمجھ میں آنے والے عشق میں بندھے ہوئے ہیں..تار کھڈی پر سے رواں ہو جائے اور کھیس جیسا تیسا بھی ہے بُنا جائے..

محمد علی ڈاکیے کے چرمی بیگ میں ایک خط آستانۂ رومی سے بھی تو آ سکتا تھا..

برس ہا برس بعد جب وہ دونوں اپنی جھرّیوں پر یقین نہ رکھتے تھے اور بالوں کو رنگتے تھے اور ایک دوسرے کے وجود اور مقام سے آگاہ تک نہ تھے کہ کون کہاں ہے، تب ایک نتالیہ اپنے رُودین کو ایک اور خط...برس ہا برس کے تعطل کے بعد بھی..لکھ سکتی تھی..

اگرچہ وہ ایک سیّد زادی تھی لیکن ذات کی وہ بھی جولاہی تھی اور برنے کی بلند ترین شاخ سے بندھے رسے میں بندھی بے سُدھ وہ بھی جھولتی تھی..

جُھولتی تھی اپنے گورے اَن چھوئے پنڈے کے ساتھ جس پر وہ ایک یاد روشنی کی مانند ہتھیلیوں پر ہی نہیں اپنی ناف تلے جو سنہری تکون تھی، اس پر بھی مہندی سے نقش و نگار اُلیکتی تھی..تا کہ اسے کوئی دیکھے..لیکن ایک ان دیدہ عشق میں ایسے مقامات کیسے آ سکتے ہیں؟ وہ جھولتی تھی ان انگلیوں کی نزاکت کے ساتھ جنہیں آستانۂ رومی کے آس پاس جو دیہات تھے، وہاں سے آنے والی عورتیں مسلسل چومتی تھیں اپنے آنسو ان پر گراتی تھیں..ایک سیّد زادی کی انگلیاں چوم کر آخرت میں ثواب حاصل کرنے کے لیے..

اور یہ سیّد زادی دراصل ایک نتالیہ تھی..

اور دیہاتی عورتیں سیّدوں گدی نشینوں کی عقیدت میں شرابور شرمسار اس کے دونوں ہاتھ ایک مقدس صحیفے کی مانند اپنے ہاتھ میں تھامے سر جھکائے اس کی انگلیوں کو چومتی جاتی تھی اور ان کے کھردرے ہاتھوں میں جو لہسن اور پیاز کی بُو رچی ہوتی تھی، وہ منتقل ہو جاتی تھی سیّد زادی کی انگلیوں کی پوروں میں..اور اسے ابکائی آتی تھی..اپنے ہاتھ چُھڑا کر وہ باتھ روم میں جا کر کسی امپورٹڈ

صابن سے انہیں خوب خوب دھوتی تھی.. بار بار پوروں کو سونگھتی تھی اور تب تک دھوتی رہتی تھی جب تک تسلی نہ ہو جاتی تھی اور پھر باہر صحن میں آ کر پلنگ پر بیٹھتی تھی تو پھر کوئی عورت سسکیاں بھرتی اپنی پھٹی ہوئی چادر چہرے پر کھینچے اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کی انگلیاں دبوچ کر انہیں چومنے لگتی تھی..

اس اَن چھوئے گورے پنڈے اور لامسی تھرتھراتی برف کی بنی ہوئی کونپلوں ایسی انگلیوں کے ساتھ وہ ایک نادیدہ عشق کے ہاتھی تلے گھر بیٹھے' چار دیواری سے نکلے بغیر اس بڑے صحن میں بیٹھے جس کی کچی دیواروں کے چوبی دروازے اتنے بلند تھے کہ ان میں سے اونٹ بھی گزر سکتے تھے.. وہیں بیٹھے بٹھائے وہ اس ہاتھی تلے روندی گئی..

سیّد زادی ذات کی جولاہی ہوگئی' برنے کے رسّے کے ساتھ بندھ ہوگئی اور عشق کی پینگ جھلانے لگی.. گھر بیٹھے بٹھائے..

عشق کے راستے نرالے ہوتے ہیں..

سٹرینج آر دی ویز آف لو..

کانونٹ کے برآمدوں میں.. راہباؤں کے سفید پیراہنوں کی سرسراہٹ کے تقدس اور تسبیح میں چلتی وہ لڑکی ایک مذہبی خانوادے سے متعلق وہ لڑکی اپنے دل میں بزرگوں کے عقیدے کے مطابق ایک گناہ اور ارتداد پالتی تھی کہ وہ سیّد زادی نہ ہو ایک راہبہ ہو.. اس خواہش کا اقرار کرنے سے آستانۂ رومی کے در و دیوار اور گنبد منہدم ہو سکتے تھے.. تباہی کے سوا اور کوئی نتیجہ نہ نکل سکتا تھا' اس لیے وہ اقرار نہ کرتی تھی.. گنگ رہتی تھی صرف چاندی کی ایک صلیب اپنی رس بھری چھاتیوں کے درمیان میں پوشیدہ کرتی کانونٹ کے برآمدوں میں چلتی تھی.. اور مجرم محسوس کیے بغیر چیتی تھی.. اگرچہ وہ ایک خانقاہی ماحول کی پروردہ تھی.. شاید اسی لیے راہبانیت اس کے اندر جڑیں پکڑتی تھی..

چاندی کی صلیب شدید سردیوں میں اسے اپنی مردہ ٹھنڈک سے آزار دیتی تھی.. البتہ گرمیوں میں اس کی حدت اس کے بدن کی حرارت سے ہم آہنگ ہو جاتی تھی..

اس کے سفید ریش ہر لحظہ ورد کرتے تسبیح پھیرتے عبادت میں مگن.. اپنے آپ میں گم ''بابا''... مرید جولاہوں کے ہاتھوں کے بنے ہوئے سفید پاکیزہ کھدر کے کرتے اور تہمد میں.. اسی کھدر کی ستھری دو چار تہوں کی سادہ پگڑی سے سر کو ڈھانکے بابا پچھلے پچیس برس سے اپنے

آستانے سے باہر نہیں آئے تھے.. نہ اپنے پیاروں کی شادیوں پر نہ ان کی موت پر.. باراتیں آستانے میں اترتیں.. دولہا دلہن اپنے سروں کو جھکا کر ان کا پیار اور دعائیں وصول کرتے اور چلے جاتے.. ان کے بیٹے بھی اور رخصت ہوتی بیٹیاں بھی.. اسی طور جنازے بھی آتے اور وہ آستانے کے صحن میں نماز جنازہ پڑھاتے.. کندھا دیتے اور دروازے سے واپس اپنے حجرے میں لوٹ جاتے..

سیدزادی ان کی فیورٹ پُتری تھی...

بچپن میں وہ ان کی گود میں کھیلتی ان کی سفید ریش میں سے پرندے تلاش کرتی.. اسے یقین تھا کہ اتنی گھنی داڑھی کے اندر پرندوں کے گھونسلے ہوں گے اور ان میں ان کے بچے ہوں گے.. انڈے ہوں گے..

''بابا پرندے کہاں ہیں..''

''تلاش کرو پُتری.. تلاش کرنے سے وہ کچھ بھی مل جاتا ہے جو نظر نہیں آتا..'' اور بابا اپنی ٹھوڑی اونچی کر کے اسے اپنی داڑھی میں ننھی منی انگلیاں چلانے کی اجازت دے دیتے..

یہ کھیل تماشا اور پرندوں کی تلاش تب تک جاری رہتی جب تک کہ اس کی ماں اسے ڈھونڈتی ہوئی حجرے میں نہ آنکلتی..

وہ اکثر غائب ہو جاتی..

ماں اس کے چھوٹے بھائی کو دودھ پلانے میں مصروف ہوتی.. وہ پچھلی کوٹھڑی کے اندر جا کر اس کے بلکتے منہ کے لیے اپنی قمیض اوپر کرتی تو وہ اس موقع کی تاک میں رہتی اور غائب ہو جاتی..

اس کے پاؤں ٹکتے نہ تھے کہ وہ شروع سے ایک آوارہ روح تھی..

سرسوں کے کھیتوں میں کُدکڑے مارتی.. ان میں سے لمبی سفید مولیاں کھینچ کر انہیں کچر کچر چباتی' بالآخر اس کی منزل بابا کا آستانہ ہوتا.. جہاں بابا اپنے استغراق میں گم ہونے کے باوجود اپنے بازو وا کر دیتے اور ان کے بازوؤں اور کھدر کے کرتے سے ایک نتھری نتھری مہک آتی.. وہ جو کچھ بھی پڑھنے میں مشغول ہوتے.. اسے مکمل کر کے اسے ایک ایسی مسکراہٹ سے نوازتے کہ وہ فوراً ان کی داڑھی میں انگلیاں چلا کر پرندے تلاش کرنے لگتی... اس سے پیشتر جب وہ اپنے ذکر میں مگن ہوتے تو چپ چاپ ان کی گود میں بیٹھی رہتی اور جونہی وہ مسکراتے اسے کھلی

چھٹی مل جاتی..

ماں حجرے میں داخل ہوتی اور یہ جانتی ہوئی کہ وہ یہیں ہوگی اور اس کے باوجود اسے بابا کی گود میں بیٹھے دیکھ کر ایک دھکا سا لگتا..وہ بل جاتی کہ یہ کہاں بیٹھی ہے اور کیا کر رہی ہے..وہ اس صدمے سے نڈھال اسے بازو سے پکڑ کر گود سے الگ کرتی اور شرمندہ کھڑی ہو جاتی..

بابا اس کو اپنے سے الگ کرنے پر کچھ نہ کہتے..ماں اسے گھسیٹتی ہوئی جب باہر لے جا رہی ہوتی تب وہ کہتے ''پتری کو کچھ نہ کہو..اسے تلاش ہے..تلاش کرنے والے کو وہ کچھ بھی مل جاتا ہے جو نظر نہیں آتا...'' اور پھر سے سر جھکا کر کچھ پڑھنے لگتے..لیکن ان کی آنکھیں اس پتری کا تب تک پیچھا کرتی رہتیں' جب تک اس کی ماں شرمندگی کے بوجھ تلے دبی اسے بازو سے پکڑے گھسیٹتی ہوئی خانقاہ کے بڑے دروازے سے باہر نہ نکل جاتی..

پھر وہ بڑی ہوگئی..

خانقاہی ماحول میں..اپنے حویلی نما گھر کی اونچی کچی دیواروں میں وہ بڑی ہوگئی..

اور اسے اپنے بچپن کے بیت جانے کا..اور بڑے ہو جانے کا احساس تب ہوا جب ایک سویر جب وہ صحن میں بچھے پلنگ پر سردیوں کی دھوپ میں ٹانگیں پسارے اونگھ رہی تھی تو کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر انگلیوں کی پوروں کو چوم لیا..

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی..

زوہراں مصلّن پلنگ کے پائے کے ساتھ لگی زاروقطار روتی..اپنے سیاہ چہرے پر آنسوؤں کی دھاریں گراتی اس کی انگلیاں چوم رہی تھی اور کہہ رہی تھی ''آلِ نبی اولاد نبی..میرا خصم' شیداں نائن کے ساتھ چلا گیا ہے..اسے واپس لے آؤ..''

''زوہراں میں اسے کیسے واپس لا سکتی ہوں بھلیے..''

''سیدزادی میرے حق میں دعا کرے اور وہ اوترا واپس نہ آئے..توبہ..توبہ..''

پھر یہ سلسلہ شروع ہوگیا..

وہ بچپن کی سرحد کو پار کر کے ادھر بدن بھرنے کے زمانوں میں آئی تو اس عقیدت اور التفات سے لطف اندوز ہونے لگی..وہ ان دیہاتنوں کی آہ وزاری کے جواب میں کچھ نہ کچھ بڑبڑا دیتی اور وہ اسے دعائیں دیتی چلی جاتیں..

لیکن اس سارے عمل کا کھوکھلا پن اسے پریشان کرتا تھا..

خانقاہ کی اندھی پجارنوں کے ہاتھوں میں سے اس کی پوروں میں منتقل ہوتی لہسن اور پیاز کی بُو اسے پریشان کرتی تھی..

اگرچہ وہ بابا کی فیورٹ پُتری تھی لیکن وہ ایک برگشتہ روح تھی..اگران کی پوتی..ایک سیّد زادی..ایک پیرانِ پیر کی پوتی..اپنی چھاتیوں کی وادی میں چاندی کی ایک صلیب چھپائے رکھتی ہے تو اس سے بڑھ کر برگشتہ اور اپنے عقیدے سے پھر جانے والی..ارتداد کی مرتکب روح اور کیا ہوگی..

لیکن یہ برگشتگی تب ابھری جب اسے نزدیکی شہر کے ایک کانونٹ میں داخل کروادیا گیا..

یہ ایک اور خانقاہِ رومی تھی اگرچہ اس کا عقیدہ الگ تھا..

وہ بڑی ہو چکی تھی۔کانونٹ میں داخل ہو چکی تھی اور اس کے باوجود جب کبھی وہ گھر لوٹتی..اگرچہ اب اس کا چھوٹا بھائی بھی بڑا ہو چکا تھا اور ماں نے مدتوں پہلے اسے دودھ پلانا ترک کردیا تھا..سفر کی تھکاوٹ اتارے بغیر اپنا سامان اور کتابیں اپنے کمرے میں پھینک کر اگلے لمحے حویلی سے باہر نکل کر خانقاہ کا رخ کرلیتی..

اگرچہ بابا کی گود مختصر ہو چکی تھی اور ان کے وا کیے جانے والے بازوؤں میں لرزش آ چکی تھی لیکن وہ سمٹ سمٹا کر اس میں بیٹھ جاتی اور آنکھیں بند کرکے کہتی ''بابا میری تلاش ختم نہیں ہوتی..''

''پتری یہ تو خوش بختی ہے..'' بابا چونک کر کہتے کہ بازو وا کرنے میں اسے گود میں لینے کے تمام تر عمل سے وہ اس لمحے تک غافل تھے اور موت کی بالآخر آمد سے آگاہ تھے''تلاش اگر ختم ہو جائے اور وہ بھی مل جائے جو نظر نہیں آتا پھر بھی شک باقی رہتا ہے..شرک زور پکڑتا ہے'اس لیے یہ تیری خوش بختی ہے کہ تیری تلاش اختتام کو نہیں پہنچتی..تو میری داڑھی میں وہ پرندے تلاش کر جو وہاں نہیں ہیں..''

اور وہ سچ مچ اتنی بڑی اور بدن کے بھر جانے والی ہونے کے باوجود ایک ننھی بچی کی مانند بابا کی ریش میں اس آس میں پرندوں کے گھونسلے تلاش کرنے لگتی کہ اگر وہ اب تک نہیں ملے تو آج مل جائیں گے..

اور بابا اپنی نقاہت..عمر رسیدگی اور موت کی قربت میں تھوڑی اونچی کرکے اپنی پُتری کو

اپنی سفید گھنی ریش میں سے وہ پرندے تلاش کرنے دیتے جو وہ جانتے تھے کہ وہ وہاں نہیں ہیں..

لیکن اگلی چھٹیوں میں جب پُتری گھر آئی تو وہ دیر تک سفر کی تھکاوٹ اتارتی رہی..نہ اس نے اپنا سامان اور کتابیں اپنے کمرے میں پھینکے اور نہ اگلے لمحے اس نے حویلی سے باہر نکل کر خانقاہ کا رخ کیا..

اس کے گلے میں ایک زنجیر سے بندھی چھاتیوں کی وادی میں آرام کرتی چاندی کی ایک صلیب تھی..

وہ قطعی طور پر مجرم محسوس نہیں کرتی تھی اس کے باوجود اسے خدشہ تھا..اور جب وہ اپنی ماں کے کہنے پر کہ ''تم ابھی تک بابا کو سلام کرنے نہیں گئیں..'' وہ گئی..حسب معمول بازو وا ہوئے.. وہ جھجکتی ہوئی سفید ریش کی ناتواں گود میں بیٹھی تو بابا اپنے استغراق سے بیدار ہوئے اور اس کے سیاہ بنگالی سحر والے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگے ''پتری..تلاش کرنے والوں کو جدا جدا منزلیں ملتی ہیں..مومن لائی لگ سے کھوجی کافر بہتر ہوتا ہے کہ وہ تلاش کرتا ہے..تو بھی کھوج کرنے والوں میں سے ہے..نہ جھجک کہ میں آگاہ ہوں..تیرے سینے کے درمیان جو کچھ تجھے آسودگی دیتا ہے اسے میں جانتا ہوں..''

''یہ جرم ہے بابا..''

''نہیں..اُس ذات کی قربت میں جانے والا کوئی بھی راستہ جرم نہیں..سبھی راستے اس ایک چوٹی پر پہنچتے ہیں..کوئی ڈھلوان پر گرتا پڑتا اپنے ٹخنے گھٹنے چھیلتا خون آلود کرتا اوپر پہنچتا ہے.. اور کوئی کسی صراطِ مستقیم پر چلتا آسانی سے وہاں جا نکلتا ہے..چوٹی تک پہنچنا سچائی ہے..کس راستے پر چلتے ہوئے وہاں تک پہنچنا ہے یہ ہمارے اختیار میں نہیں..''

''بابا..میں کیا کروں؟''

''تم میری داڑھی میں پرندے تلاش کرو کہ میں ایک عرصے سے تمہاری انگلیوں کا منتظر تھا..چلو پُتری..''

اور بابا نے اپنی ٹھوڑی اونچی کر دی..

اس کا باپ ایک آوارہ گرد شکاری تھا۔ لیکن ظالم نہ تھا' دھیما اور خاموش طبع تھا۔۔

شکار کے شوقین عام طور پر منہ اندھیرے گھر سے نکلتے ہیں۔۔ جہاں شکار کی شنید ہو وہاں بروقت پہنچتے ہیں اور شام ڈھلے لوٹ آتے ہیں۔۔ کچھ وہاں جھیلوں جوہڑوں اور دریا میں ابھرتے ہوئے ریتلے ٹاپوؤں پر خیموں یا کچے کوٹھوں میں دو چار دن کے لیے مقیم ہو جاتے ہیں لیکن اس کا باپ گھر سے نکلتا تھا تو اکثر موسم بدل جانے پر ہی گھر واپس آتا تھا۔ مہینوں غائب رہتا تھا اور جب واپس آتا تھا تو کبھی اس کے تھیلے میں شکار کیے گئے پرندے نہ ہوتے تھے۔ اس کی ماں سمجھوتہ کر چکی تھی کہ زندگی یونہی گزارنی ہے۔۔

اور سید زادی کے لیے یہ باپ ایک ورائٹی تھی جسے کبھی کبھار دیکھ کر وہ اپنی آنکھوں کا ذائقہ بدل لیتی تھی۔۔ ورنہ اس کے لیے بابا کافی تھے۔۔

بابا کو بھی اپنے نزدیکی عزیز کی اس آل اولاد سے غفلت کا شدید احساس ہوگا۔۔

باپ کی ساری ڈاک وہ وصول کرتی۔۔

اس کے نام جو خط آتے وہ اس کے باپ کے نام ہوتے اور وہ رودین کی ہینڈ رائٹنگ سے جان جاتی کہ یہ میرے لیے ہے۔۔

کانونٹ کے بلند چھتوں والے گوتھک طرز کے کیتھڈرل میں جب یسوع کی شان میں گیت گائے جاتے تو وہ پچھلے بنچوں پر چپ بیٹھی رہتی اگرچہ راہباؤں کی خواہش ہوتی کہ غیر مذہب کی یہ کافر لڑکیاں گانے میں شامل ہو جائیں۔۔ کیا پتہ یہ سیدھے راستے پر آ جائیں' یسوع کی بھیڑیں بن جائیں اور ان کی عاقبت سنور جائے لیکن وہ چپ بیٹھی رہتی' البتہ ایک بار جب ڈچ مشنریوں اور راہباؤں کا ایک گروپ ان کے کانونٹ میں آیا اور انہوں نے آرگن کی بلند آہنگ ۔۔

مصلوب عیسیٰ کے مجسّموں سے ٹکراتی.. مریم کے پتھریلے لبادوں کو چومتی موسیقی کی ہمراہی میں ''آوے ماریا'' پورے منہ کھول کر مریم کی محبت میں سرشار ہو کر گانا شروع کیا تو اس کے لب خود بخود ہلنے لگے کہ اس گیت میں بلا کی کشش اور روحانی خوبصورتی تھی..

اسے محسوس ہوا کہ اس کی چھاتیوں میں آرام کرتی چاندی کی صلیب خالی نہیں اس پر عیسیٰ کا مصلوب بدن ہے اور اس کے دامن میں بیٹھی مریم بین کر رہی ہے...

بابا کے علاوہ صرف ثریا آپا کو اس صلیب کی موجودگی کا علم تھا..

آپا ثریا کی شادی نہیں ہوئی تھی.. انہوں نے اپنے آپ کو عبادت کے لیے وقف کر رکھا تھا' ہمیشہ سیاہ لباس میں سوگوار رہتی تھیں.. غم حسین میں سینہ کوبی کرتی تھیں اور دنیا کی آسائش سے منہ موڑے آستانہ رومی میں راہبانیت کی زندگی گزارتی تھیں..

وہ اس سے اتنی بڑی تھیں کہ بچپن میں اسے نہلایا کرتی تھیں..

یہ نہلانا تب موقوف ہوا جب آپا ثریا کو اس کے تیزی سے تبدیل ہوتے بدن سے شرم آنے لگی.. اسے تو بالکل سمجھ نہ آتی کہ آپا ثریا اب اسے نہلانے سے کیوں اجتناب کرنے لگی ہیں.. نہلانے کا متبادل انہوں نے یہ سوچا کہ پتری کی گردن اور کندھوں پر باقاعدگی سے السی کے تیل کی مالش کی جائے تاکہ پڑھائی کی نشست میں اس کے جو پٹھے تن جاتے ہیں وہ ملائم اور پرسکون ہو جائیں۔

اسی ایک مالش کے دوران آپا ثریا کا ہاتھ اس کی گردن کے گرد گورے بدن پر لیٹی زنجیر پر پڑا اور انہوں نے محض تجسس کی خاطر اسے کھینچ کر دیکھا کہ اس کے ساتھ جولاکٹ بندھا ہے اس پر اللہ کا نام ہے یا ہمارے پیغمبر کا...

اور وہاں ایک صلیب تھی چاندی کی.. ثریا آپا کا رنگ فق ہو گیا.. ان کا پورا بدن لرزش میں آ گیا اور وہ بلند آواز میں لرزتی اور خوفزدہ آواز میں لاحول پڑھنے لگیں..

وہ.. ثریا آپا کے مشاق ہاتھوں کے لمس کے لطف میں ادھ موئی پڑی تھی اور اسے یکدم کچھ گمان نہ ہوا کہ کیا ہوا ہے۔ جب تک آپا نے زنجیر کو نہایت شدت سے کھینچ کر اسے توڑنے کی کوشش نہ کی.. تب وہ بیدار ہو گئی.. اور آپا کا ہاتھ پکڑ لیا..

''آپا.. کیا ہوا ہے؟''

آپا کا سانس اکھڑنے کو آ رہا تھا.. ''میں نے تو پہلے دن سے دہائی دی تھی کہ پتری کو ان

کرسٹانوں کے سکول میں داخل نہ کراؤ.. پہلے دن سے کہتی تھی... پُتری تو اپنے حسب نسب کو بھول گئی..''

اسے احساس ہو گیا کہ کیا سانحہ ہو گیا ہے۔ ''آپا یہ تو فیشن ہے.. آپ پنج تن پاک کی قسم لے لو میں نے اسے محض فیشن کے طور پر پہنا ہے..''

وہ آپا کو یہ بتا ہی نہیں سکتی تھی کہ بابا کو بھی علم ہو گیا ہے اور انہوں نے کوئی سرزنش نہیں کی..

''تو پھر اس شیطانی شے کو اتار دو..'' وہ مسلسل کچھ نہ کچھ پڑھے جا رہی تھی... ''میں تو پہلے دن یہ کہتی تھی۔''

''اتار دی..'' اس نے زنجیر کھول دی..

''اب اسے پھینک دو..''

''کہاں؟''

''میں پھینک آتی ہوں.. اگرچہ میں اس ہاتھ لگانے سے آلودہ ہوتی ہوں۔''

''دراصل آپا یہ صلیب مجھے میری ایک نہایت عزیز کلاس فیلو نے سالگرہ کے تحفے کے طور پر دی تھی.. قیمتی ہے.. میں اسے واپس کر دوں گی.. کل ہی..''

''میں کل کے بعد اس منحوس شے کو نہ دیکھوں..''

''نہیں دیکھیں گی آپا.. وعدہ..''

ثریا آپا بڑبڑاتی ہوئی.. اپنے سیاہ پوش ان چھوئے بدن میں اپنی عبادت اور پاکیزگی کا بوجھ برداشت کرتی.. چلی گئیں..

اگلی بار جب ثریا آپا السی کے تیل کی کپی تھامے اس کی گردن کی رگوں کو سکون دینے کی خاطر مالش کرنے آئیں تو اس نے انکار کر دیا.. ''ثریا آپا.. مجھے السی کے تیل سے الرجی ہے.. میرے پورے بدن پر پھپھولے سے ابھرنے لگتے ہیں..''

وہ ایک برگشتہ روح تھی.. لیکن اس کی برگشتگی ایک چاندی کی صلیب تک ہی محدود نہ تھی.. اس سے بہت آگے جاتی تھی..

وہ.. ایک نہایت پُریقین اور ایماندار کمیونسٹ بھی تھی..

یہ ایک عجیب و غریب کمبی نیشن تھا.. آستانۂ رومی کی سیّد زادی.. چاندی کی صلیب اور

مارکس اور لینن کی گرویدہ..

وہ پیدائشی طور پر سید زادی تھی.. جذباتی طور پر ایک صلیب کی گرویدہ تھی اور انقلاب نے اسے موہ کر اس کی حسیات میں راستے بنائے تھے.. ان راستوں پر اسے اس کے بڑے بھائی سوان نے ڈالا تھا..

سوان خانقاہی ماحول کا ایک مخصوص کردار تھا۔ نکما' آوارہ گرد' اچھا پہننا' اچھا کھانا اور کچھ نہ کرنا.. سفید داڑھیوں والے خانقاہی درویش ہمہ وقت خدمت پر معمور اس کے پاؤں چھونے کو سعادت سمجھتے.. یہ چھوٹے شاہ صاحب بیشتر پیر بچوں کی مانند کند ذہن اور لڑاکے تھے.. گاؤں کے کسی لڑکے کی مجال نہ تھی کہ وہ قریب سے گزریں تو اپنا راستہ چھوڑ کر کھیت میں اتر کر ہاتھ باندھ کر وہ نظریں نیچی کیے تب تک کھڑا نہ رہے جب تک وہ گزر نہ جائیں.. چھوٹے شاہ صاحب کا ہاتھ بھی اکثر چھوٹ جاتا تھا اور وہ من کی موج میں آ کر کسی بھی مرید یا راہگیر کو پیٹ سکتے تھے اور وہ مار کھاتا ہوا بھی سر جھکائے رکھتا تھا کہ کہیں بے ادبی نہ ہو جائے.. اس کے بزرگوں میں ایک ایسے بڑے پیر صاحب بھی گزرے تھے جو پیر مٹھا کہلاتے تھے کیونکہ انہیں مٹھائی بہت مرغوب تھی.. ان کا آستانہ طرح طرح کی مٹھائیوں سے بھرا رہتا اور ان کے پیروکاروں کی سب سے بڑی خواہش یہی ہوتی کہ وہ ان کی پیش کردہ مٹھائی میں سے صرف ایک لڈو کو چکھ ہی لیں اور وہ اکثر سرفراز فرما دیتے.. پیر مٹھا صرف مٹھائی کے یوں شوقین تھے کہ انہیں کشف ہوا تھا کہ وہسکی کی سفید اور سیاہ کتوں والی پوری بوتل پینے کے بعد اگر مٹھائی کھائی جائے تو ایک اور بوتل کا نشہ ہو جاتا ہے.. پیر مٹھا ہمیشہ عالم جذب میں رہتے اس لیے باقاعدہ نماز پڑھنے کا اتفاق کم ہی ہوتا' البتہ کبھی کبھار اسی عالم سرشاری میں روحانی مستی میں اپنے مریدوں اور ملازموں کو حکم دیتے کہ کم بختو نماز پڑھو تم پر فرض ہے.. یہ حکم اکثر اوقات گئی رات ایسے وقتوں میں دیا جاتا' جب کسی بھی نماز کا وقت نہ ہوتا.. اور تاکید یہ کی جاتی کہ بلند آواز میں پڑھو تا کہ میں تمہاری گنوار پن کی عربی کا تلفظ درست کر سکوں.. مرید اور ملازم فوری طور پر قطار باندھ کر جانے کون سی نماز کی نیت کر کے کھڑے ہو جاتے اور بلند آواز میں کورس میں نماز پڑھنے لگتے.. اور پیر مٹھا کو یہ کریڈٹ بہر حال جاتا تھا کہ وہ عالم جذب میں بھی زیر زبر کا ایسا حساب رکھتے تھے کہ جونہی کسی سے تلفظ میں ذرا سی بھی چوک ہوئی وہ اس کی کمر پر ایک ٹھڈا رسید کر کے کہتے ''خبیث.. سراط کہہ رہا ہے.. کہہ صراط.. ص سے.. کم بخت کیوں جہنم خرید رہا ہے.. روز حشر تیرے منہ میں پیپ ڈالی جائے گی کہ غلط تلفظ سے نماز پڑھتا رہا ہے خبیث...''

مرید اور ملازمین حتی الوسع اپنا تلفظ درست کرنے کی سعی کرتے اور مسلسل نماز پڑھتے رہتے..اس دوران پیر مٹھا یادالٰہی میں اتنے مگن ہوتے کہ انہیں اپنی خبر نہ رہتی اور کچھ مریدین اپنی نماز توڑ کر انہیں بمشکل اٹھا کر کہ وہ قدرے فربہ تھے' ان کے فرانس سے لائے ہوئے بڑے پلنگ پر جالٹاتے اور الٹے پاؤں لوٹ آتے..

کبھی کبھار پیر مٹھا وجدان میں آ کر مریدوں اور ملازموں..جب کہ وہ ان کے حکم کے تابع نماز کی نیت میں ہوتے..ان کے آگے ایک امام کی طرح کھڑے ہو کر بلند آواز میں تلاوت فرمانے لگتے..

نہ وہ کہیں لڑکھڑاتے..نہ ڈولتے..نہ ان کی زبان وہسکی کی پوری بوتل بھاری کر سکتی اور وہ بلند آواز میں مصری لہجے میں قرآن پاک کی قرآت کرنے لگتے.. پورا گاؤں..سوتے ہوئے بیدار ہو جاتا..ان کی بلند آہنگ تلاوت میں اتنا اثر تھا..لوگ روتے روتے اپنے گال گیلے کر لیتے.. ان کی تلاوت میں شیرینی ایسی ہوا کرتی تھی..

سوان جو پیر مٹھا کی نسل سے بہت برس بعد وجود میں آیا تھا' اس کے بارے میں بھی گاؤں کے بڑے بوڑھے یہی پیش گوئی کرتے تھے کہ یہ سوان ایک اور پیر مٹھا ہوگا..

سوان..ناکارہ اور کند ذہن..مریدوں سے اپنا تن بدن دبواتا..انہیں خواہ مخواہ زدوکوب کرتا' دو سفید اور سیاہ کتوں والی وہسکی نہیں پیتا تھا..کیکر اور گنے کی شراب پیتا تھا..اس میں بھی خوش الحانی بہت تھی..اس نے بمشکل میٹرک پاس کیا اور پھر ایڈورڈز کالج میں ایک تگڑی سفارش کی بنا پر داخل ہو گیا..ایف اے تک وہ وہیں رہا اور بی اے میں داخل ہوتے ہی وہ کچھ اور ہو گیا..وہ منہ کھولے ایک ایسے عیسائی پروفیسر کے لیکچر سنتا رہا جو ایک عمر کنوارا رہنے کے بعد کسی احمدی خاتون سے شادی کر بیٹھا تھا...

پروفیسر اعجاز کے لیکچروں نے اسے ہلا کر رکھ دیا...اس کے آستانۂ رومی کو ہلا کر رکھ دیا..

پروفیسر کے آس پاس کچھ اور انقلابی بھی تھے..اور وہ ان کی صحبت میں بیٹھ کر اپنے خاندانی پس منظر کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگا...

اگرچہ کند ذہن تھا پر اس رفاقت میں اس کا ذہن کام کرنے لگا..

اسے اپنے آپ پر ندامت ہونے لگی..

کہ میں آج تک کیا کرتا آیا ہوں..

تب وہ ترقی پسند گروہ کے اراکین کی سفارش پر ایڈورڈ کالج سے معمولی سا بی اے کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے ماسکو کی پیٹرس لومبا یونیورسٹی میں چلا گیا..

اور یہیں سے وہ کونپلیں پھوٹیں جو نتالیہ کے آستانۂ رومی میں شگاف کرتی ہوئیں ایک لادین نظام کے باوجود نہایت کومل اور مستقبل کی درخشندگی کی علامت تھیں..اگرچہ نہیں تھیں..

سوان اسے ماسکو کے عوامی اشاعت گھر سے شائع ہونے والے روسی ادب کے اردو میں ترجمہ شدہ پلندے بھیجتا..وہ روسی زندگی کی سادگی اور مزدوروں کی بے مثال قوت جو ایک کمیونسٹ معاشرہ تشکیل کرنے کے لیے دن رات خون پسینہ ایک کر رہی تھی ان کے قصے بیان کرتا..

یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتے اپنے افریقی اور جنوبی امریکی ساتھیوں کے جوش اور ولولے کی داستانیں سناتا کہ وہ کیسے اپنے اپنے ملکوں میں واپسی پر غیر ملکی آقاؤں سے نجات حاصل کرنے اور وہاں برابری کا یہ نظام رائج کرنے کا عزم رکھتے تھے..کانگو کے ترقی پسند اور شعلہ بیان لیڈر پیٹرس لومبا کو جب استعماری طاقتوں نے اپنے راستے کی دیوار جان کر قتل کروا دیا تو ماسکو یونیورسٹی کا نام بدل کر اسے پیٹرس لومبا یونیورسٹی کا نام دے دیا گیا چنانچہ افریقی طالب علم تعداد میں یورپی' امریکی اور ایشیائی طالب علموں کی نسبت کہیں بڑھ کر تھے..سوان کے سرہانے ہمیشہ ''داس کیپٹل'' پڑی رہتی اور وہ اس کا مطالعہ اسی عقیدت اور جذبے سے کرتا جیسے ایک زمانے میں وہ اپنی مقدس کتاب کا کیا کرتا تھا..

وہ یکسر بدل چکا تھا..لینن کے ہر موضوع پر نظریات اسے ازبر تھے اور وہ سوویت یونین کو ایک رہنما ستارے کی حیثیت سے صدق دل سے قبول کرتا تھا جس کی روشنی میں وطن واپسی پر اس نے خانقاہی اور جاگیرداری نظام کا قلع قمع کرنے کی جدوجہد میں شامل ہو کر ایک بے مثال' آج تک انسانی سوچ میں نہ آیا ہوا ایک ایسا مساواتی نظام تشکیل دینا تھا' جس میں سوویت یونین کی مانند خلق خدا راج کرے گی اور تب تخت اچھالے جائیں گے اور راج کرے گی..خلق خدا..

وہ اکثر اپنے خطوں میں اپنی دوست روسی لڑکیوں کا تذکرہ کرتا اور نتالیہ اپنے گورے چہرے پر ایک نامعلوم لالی تیرتی محسوس کرتی۔ان کی تفصیل پڑھتی کہ کیسے وہ مردوں کی برابری میں ایک نیا نظام تشکیل دے رہی ہیں اور کیسے انہیں اپنے کلاسیکی شاعر اور ادیب ازبر ہیں اور وہ پوشکن اور گورکی کے حوالوں کے بغیر محبت بھی نہیں کر سکتیں..

نتالیہ آستانۂ رومی کے ماحول میں بیٹھی ہوئی ان اردو میں ترجمہ شدہ روسی ناولوں اور

شاعری سے متاثر ہونے لگی.. وہ کسی حد تک ایک نسوانی سوان ہوگئی کہ اسے بھی اس خانقاہی اور جاگیرداری نظام کے کھوکھلے پن سے وحشت ہونے لگی اور وہ بھی ایک بڑے انقلاب کے خواب دیکھنے لگی..

اس کے سارے خواب سوویت یونین اور اس کے ادب اور شاعری سے منسلک ہو گئے.. وہ ظ۔انصاری کے ترجمہ شدہ ناولوں کی خصوصی زبان اپنے اظہار کے لیے.. گفتگو میں اور تحریر میں بھی لاشعوری طور پر اختیار کرنے لگی.. آستانۂ رومی کے اردگرد جو ہرے بھرے حد نظر تک پھیلے کھیت اور چراگاہیں تھیں انہیں وہ دیکھتی تو ٹالسٹائی اور شولوخوف کے ''اور ڈان بہتا رہا'' کی نظر سے دیکھتی جیسے وہ روسی سرزمین اور وسیع میدانوں کے نقشے تحریر میں کھینچتے تھے.. صرف پوشکن کی آوارہ منش شاعری اس کی چھاتیوں کے درمیان آرام کرتی چاندی کی صلیب کے نیچے جو دل تھا اس کی دھڑکن اتنی تیز کر دیتی کہ صلیب بے آرام ہونے لگتی..

وہ بھی سوان کو نہایت طویل خطوط لکھتی.. اور اتنی طوالت عام رائٹنگ پیڈ میں نہ سما سکتی تھی' اس لیے وہ انہیں لیگیر دار رجسٹر کے فل سکیپ ورقوں پر لکھتی اور لکھتی چلی جاتی..

بابا کے پاس اس کی آمد و رفت اتنی کم ہوگئی کہ بعض اوقات بابا کا پیغام آجاتا کہ پتری بے شک تلاش جاری رکھو لیکن اپنے حال سے ناتا نہ توڑو..

انہی وقتوں میں اس نے ٹیلی ویژن پر رودین کو ''ادب اور معاشرہ'' کے موضوع پر ایک ٹاک شو میں گفتگو کرتے دیکھا.. پھر کسی اور پروگرام میں اسے باتیں کرتے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے دیکھا تو وہ اس کی گرویدہ ہوگئی.. پوشکن کی ساری شاعری گویا اس کی شخصیت اور خیالات تھے.. وہ جیسے چاندی کی ایک صلیب اور کمیونزم کے سحر میں آئی تھی ویسے ہی اس کے مڈل ایج دھیمے پن اور سیاہ آنکھوں کی اسیر ہوگئی.. اور تب اس نے اسے اپنا پہلا خط لکھا.. رجسٹر کے اس لیگیر دار کھردرے فل سکیپ کاغذ پر..

تسلیمات!

آپ کو کافی دنوں سے خط لکھنے کا ارادہ تھا مگر حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ خیال گزرتا تھا کہ آپ ایک بڑے آدمی ہیں' مشہور آدمی ہیں اس لیے مغرور بھی لازمی طور پر ہوں گے پھر مصروف بھی ہوتے ہوں گے۔ ان سب باتوں کو سوچنے کے

باوجود بھی آخر آپ کو خط لکھنے کا حوصلہ کر ہی لیا۔ جانتے ہیں کیوں؟ اس لیے کہ آپ بُرے آدمی نہیں لگتے۔

عرض یہ ہے کہ جناب مجھے لکھنے پڑھنے کا شوق رہا ہے۔ نصاب کی کتب سے زیادہ (معیاری و مقبول) غیر نصابی کتب و رسائل و جرائد پڑھنے کا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ بچپن ہی سے مجھے کتابیں پڑھنے کا اتنا شوق تھا کہ میں گاؤں سے اپنے والد صاحب کے ہمراہ جب شہر جاتی تھی تو کھلونے یا کھانے پینے کی اشیاء کی بجائے ہمیشہ بچوں کے رسالے اور کہانیوں کی کتابیں خریدنے پر اصرار کرتی تھی۔

جب میں کالج میں پہنچی جناب تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں پڑھنے کے علاوہ کچھ لکھ بھی سکتی ہوں۔ اس طرح میں نے کالج میگزین میں لکھنا شروع کیا پھر جب بی۔ اے کے فائنل ایئر میں پہنچی تو میگزین کے اُردو حصے کی انچارج بن گئی اور اخبارات وغیرہ میں بھی لکھنا شروع کر دیا۔

بی۔ اے کے بعد میرا شہر سے رابطہ بالکل ختم ہو گیا ہے۔ میں گھر میں ہوتی ہوں اور کچھ نہ کچھ لکھتی رہتی ہوں اور پھاڑتی رہتی ہوں جیسے اطمینان نہیں ہوتا تسلی نہیں ہوتی۔ مجھے کوئی رہبری کرنے والا نہیں.... گاؤں کے ماحول اور لوگوں میں شعر کہنے یا افسانے لکھنے اور وہ بھی ایک لڑکی سے تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ میرے بھائی اور والد ہیں انہوں نے کبھی میرے اس ذوق یا شوق کو سنجیدگی سے سمجھا ہی نہیں۔ سب ہنستے اور مذاق اُڑاتے ہیں۔ مگر میں کیا کروں میرے اردگرد پھیلی ہوئی خوبصورت اور حسین چیزیں سرسوں کے کھیت' کیکر پھلاہی شیشم اور سرس کے درخت ہوا کے جھونکوں میں بسی ہوئی ان کی مہک ان کی شاخوں پر کوکتی فاختاؤں کی سوز و سکون بھری آوازیں' سبز کھیتوں اور مٹیالے میدانوں میں بل کھاتی پگڈنڈیاں' مویشی چراتے ہوئے لوگ' بے فکری اور آسودگی سے چرتی ہوئی گائیں' کنوئیں پر پانی بھرتی عورتیں' تسلے سروں پر رکھے گوبر چنتے بچے اور فصل کاٹتی عورتیں غرض کیا کیا لکھوں چھت پر کھڑی ہو کر اکثر صبح و شام کا نظارہ کرتی رہتی ہوں اور یہ سب چیزیں اور بے شمار دوسری معمولی اور غیر اہم چیزیں اردگرد پھیلے ہوئے لوگ جیسے سب کاغذ بن کر میرے قلم کے نیچے آ جاتے ہیں اور مجھے مجبور کرتے ہیں کچھ لکھو'